کہ اصلاح کا کوئی بندوبست کرنے سے پہلے اس متعذرانہ جذبہ سے اپنے تئیں بالکلیہ آزاد کرلیں جو انہوں نے اپنے دین کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے۔ ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ غیرت و خودداری کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ اسے اس امر کا پورا پورا احساس ہونا چاہئے کہ اس کی ذات مابقیٰ دنیا سے متمیز و مختلف ہے۔ اسے چاہئے کہ اپنے مختلف ہونے پر فخر کرنا سیکھے۔ اسے چاہئے کہ اس فرق و اختلاف کی ایک گراں بہا وصف کی طرح حفاظت و حیانت کرے۔ اور دنیا کے سامنے اس کا دلیری سے اعلان کرتا رہے ـــــ بجائے اس کے کہ اس کے متعلق معذرت پیش کرتا پھرے اور دوسرے ثقافتی حلقوں میں مدغم ہونے کی کوشش کرتا رہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ مسلمان خارج سے آنے والی صداؤں سے اپنے تئیں بالکل ہی بے تعلق رکھیں ان پر کوئی کان ہی نہ دھریں۔ اپنی تہذیب کو مضرت پہنچائے بغیر اجنبی تہذیب سے ایجابی موثرات ہمیشہ اخذ و قبول کئے جاسکتے ہیں۔ اس قسم کی مثال ہمیں یورپی نشاۃ ثانیہ میں ملتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یورپ نے آموزش کے مواد و منہاج میں عربوں کے اثرات کس مستعدی کے ساتھ قبول کر لئے تھے۔ لیکن یورپ نے عربی ثقافت کی ظاہری وضع اور ثقافت کی روح کی تقلید کبھی نہیں کی اور نہ اپنی عقلی اور جمالیاتی خودمختاری کو کبھی قربان کیا۔ یورپ نے اپنے زمانہ میں ہیلاتیاتی اثرات استعمال کئے تھے۔ ان دونوں صورتوں میں یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ایک ایسی طاقتور ملکی تہذیب پروان چڑھی گئی جو فخر و خود اعتمادی سے بھرپور تھی۔ اس فخر کو کھوکر اور اپنے ماضی سے رشتہ ناتہ توڑ کر کوئی تہذیب نہ صرف پھل پھول ہی نہیں سکتی بلکہ اپنا وجود بھی باقی نہیں رکھ سکتی۔

دنیائے اسلام کی ذہنی اور سماجی غفلت | لیکن دنیائے اسلام کا یہ حال ہے کہ یورپی تہذیب کی تقلید کرنے اور مغربی تصورات و خیالات کو جذب کرنے کی طرف اپنے بڑھتے ہوئے میلان کے ساتھ ان بندھنوں کو تدریج توڑتی چلی جارہی ہے جو اسے اپنے ماضی سے جوڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ نہ صرف ثقافتی اعتبار ہی سے پسپا ہوتی جارہی ہے بلکہ روحانی اعتبار سے بھی۔ اس کی مثال اس درخت کی سی ہے جو اس وقت تک مضبوط تنا ور رہا جب تک اس کی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں پیوست تھیں۔ لیکن مغربی تہذیب کے کوہستانی دھارے نے مٹی کا ایسا صفایا کیا کہ یہ جڑیں اوپر کو نکل آئیں۔ درخت قلت غذا کی وجہ سے آہستہ آہستہ کمزور و ناتواں ہوتا جارہا ہے۔ اسکی پتیاں جھڑتی اور ٹہنیاں سوکھتی جارہی ہیں۔ اب تو اس کا ایک تنا ہی باقی رہ گیا ہے جس کے گر پڑنے کا خطرہ ہر آن لگا ہوا ہے۔

پھر تو مغربی دنیائے اسلام کو اس ذہنی اور سماجی غفلت سے بیدار کرنے کا صحیح ذریعہ ہرگز نہیں ہو سکتی جو اس انحطاط نے طاری کر رکھی ہے، جس نے ایک عملی مذہب کو ایک رواج محض کے مرتبہ پر گرا دیا ہے۔ پھر مسلمان اپنے لئے روحانی اور عقلی تہیج و تشویق کہاں سے حاصل کریں جسکی انہیں آج اتنی شدید ضرورت ہے۔؟

اس کا جواب اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ سوال۔ یہ تو خود سوال کے اندر ہی موجود ہے، جیسا کہ کئی بار بتایا جا چکا ہے کہ اسلام نہ صرف "دل کا عقیدہ" ہی ہے بلکہ انفرادی اور سماجی زندگی کا ایک نہایت ہی واضح اور معروف نظام بھی ہے، اگر اس کو ایک ایسی اجنبی تہذیب میں مدغم کر دیا جاتا ہے جسکی اخلاقی بنیادیں سر تا سر مختلف ہوں تو یہ بالکل ہی برباد ہو جائے گا۔ لیکن اگر اسے دوبارہ اپنے منصب صداقت پر فائز کر دیا جاتا ہے۔ اور ایک ایسے عامل کی قدر عطا کر دی جاتی ہے جو ہمارے شخصی اور سماجی وجود کے تمام پہلوؤں کو متعین و متشکل کرتا ہے، تو پھر اس میں ایک نئی زندگی پیدا ہو سکتی ہے۔

نئے تصورات اور متصادم ثقافتی لہروں کے زیر اثر جو اس دور کی مخصوص خصوصیت ہیں، جس میں ہم رہ رہے ہیں، اسلام ایک خالی پیکر کی حیثیت سے زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہ سکتا۔ اس پر سے صدیوں کی نیند کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ اب تو اس کے لئے صرف دو ہی صورتیں ہیں، یا تو وہ خواب سے بیدار ہو جائے یا موت سے ہم کنار ہو جائے۔

آج جو مسئلہ مسلمانوں کو درپیش ہے وہ ایک ایسے مسافر کا مسئلہ ہے جو ایک دوراہے پر پہنچ گیا ہے، یا تو وہ اپنی جگہ کھڑا رہ جائے، آگے قدم نہ بڑھائے۔ اس صورت میں وہ فاقوں کی موت مر جائے گا۔ یا وہ اس راہ پر چل پڑے جس پر اس عبارت کی تختی لگی ہے "مغربی تہذیب کی طرف" اس صورت میں اسے اپنے ماضی کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دینا ہوگا۔ یا وہ دوسری راہ اختیار کرے جس پر اس عبارت کی تختی لگی ہے۔ "صداقت اسلام کی طرف"۔ یہی اور صرف یہی وہ راہ ہے جو ان لوگوں کے قلب و دماغ کو اپنی طرف کھینچتی ہے، جو اپنے ماضی پر اور اس ماضی کے ایک زندہ مستقبل کی صورت میں مبدل ہو جانے کے امکان پر یقین رکھتے ہیں۔

دیرینہ، پیچیدہ، جسمانی، روحانی امراض کے خاص معالج
جمال شفاخانہ رجسٹرڈ۔ نوشہرہ ضلع پشاور

جہادِ حریت میں علماءِ حق کا حصہ

ہمارے اسلاف

جناب اختر راہی۔ بی اے

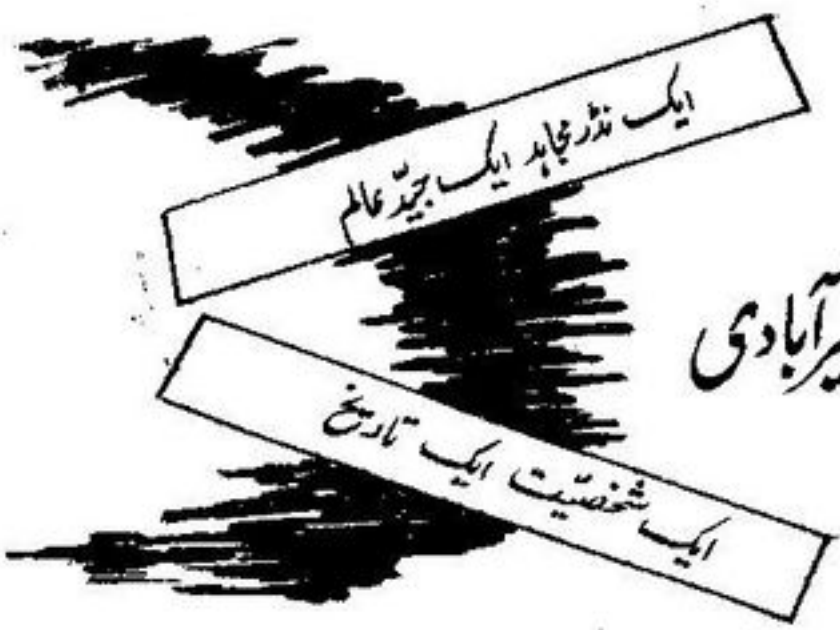

علامہ فضل حق خیرآبادی

خاندان | مولانا فضل حق کے جدِّ امجد بہاء الدین اپنے بھائی شمس الدین کے ہمراہ ہندوستان آئے، شمس الدین رُہتک کی مجلسِ افتاء پر رونق افروز ہوئے اور بہاء الدین قاضیٔ بدایونی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ شمس الدین کی اولاد میں امام الہند شاہ ولی اللہؒ جیسے فخرِ روزگار نے جنم لیا اور بہاء الدین کی نسل میں فضل حق خیرآبادی جیسے مجاہدِ آزادی نے نام پیدا کیا۔ سرزمینِ ہند میں یہ خاندان اپنی تابندہ روایات کے طفیل علمی وجاہت اور مذہبی سیادت کا حامل تھا۔ اسی سندِ درس وارشاد کا وارث فضل حق وقت آنے میں میدانِ جہد وجہاد میں کود پڑا۔

مولوی رحمٰن علی نے انہیں عمری، حنفی، ماتریدی اور چشتی کے القاب سے یاد کیا ہے[1]۔ یعنی مولانا کا نسب خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ مولانا عبدالشاہد خان شروانی مقدمہ نگار "الثورۃ الہندیہ" کی رائے کے بموجب ۳۳ واسطوں کے ذریعے یہ سلسلۂ نسب قائم ہوتا ہے[2]۔ فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی ہیں۔ کلامی مسائل میں ماتریدی نقطۂ نگاہ کے حامل ہیں اور تصوف میں چشتی سلسلے سے منسلک ہیں۔ انہوں نے دھومن شاہ دہلوی سے بیعت کی تھی۔

مولانا فضل حق کے والد فضل امام دہلی میں "صدر الصدور" کے عہدے پر فائز تھے۔ ابتدائی تعلیم ان سے ہی حاصل کی، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے حدیث کا درس لیا[3]۔ عبدالشاہد خان

---

[1] تذکرۂ علماء ہند ص۱۶۴، [2] الثورۃ الہندیہ، مقدمہ، ص۱۲، [3] تذکرہ علمائے ہند ص۱۶۴

کے خیال میں شاہ عبدالعزیز سے بھی فیض اٹھایا۔[1] سنہ ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں پیدا ہوئے اور تیرہ برس کی عمر میں علوم مروّجہ میں عبور حاصل کر لیا۔ ان کے ہم درسوں میں مفتی صدرالدین آزردہ کا نام خاصی شہرت کا حامل ہے۔ اس دور کا ذکر کرتے ہوئے عبدالشاہد خان لکھتے ہیں کہ مولانا فضل حق درس لینے رئیسانہ ٹھاٹ باٹ سے جایا کرتے تھے۔ اس سے ان کی امارت اور ناز و نعم کا پتہ چلتا ہے۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ چار ماہ اور کچھ دنوں میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔[2]

عبدالشاہد خان نے ایک روایت بیان کی ہے کہ تحفۂ اثنا عشریہ (سن تالیف ۹۰-۱۷۸۹ء) کی اشاعت پر ایران سے باقر داماد صاحب افق المبین کے خاندان کا ایک جیّد عالم شاہ صاحب سے مناظرے کی غرض سے دہلی آیا۔ شاہ صاحب نے مہمان کی شب گزاری کا سامان کر دیا۔ شام کے وقت فضل حق مہمان کے ہاں گئے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد علمی بحث شروع ہو گئی۔ مولانا نے "افق المبین" پر اعتراضات کئے جن کا جواب ایرانی عالم سے نہ بن پڑا۔ پھر خود ہی ان اعتراضات کو رفع کیا۔ اس رٹکے سے وہ جیّد عالم اسقدر متاثر ہوا کہ مناظرے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔[3] سوچا کہ جس شخص کے شاگردوں کی ذہانت و مہارت کا یہ عالم ہے وہ خود کس درجے کا ہوگا۔

مدارس اسلامیہ میں قدیم سے یہ خیال چلا آتا ہے کہ جب تک پڑھا ہوا پڑھایا نہ جائے علم میں پختگی نہیں آتی۔ چنانچہ مولانا فضل حق نے بھی درس و تدریس کا شغل اختیار کر لیا۔ مولوی رحمٰن علی لکھتے ہیں کہ ایک بار لکھنؤ میں مولانا کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ دیکھا کہ حقہ پی رہے تھے اور شطرنج بھی کھیل رہے تھے۔ ساتھ ساتھ ایک طالب علم کو "افق المبین" کا درس بھی دے رہے تھے۔ اور تمام مطالب بڑی خوبی سے بیان کرتے جا رہے تھے۔[4]

چودہ پندرہ کا سن تھا کہ درس و تدریس شروع کی۔ مولانا فضل امام نے ایک کند ذہن خاصی عمر کا طالب علم ان کے حوالے کر دیا۔ اسے تھوڑا سا سبق پڑھایا اور پھر کتاب اٹھا کر پھینک دی۔ اس پر وہ طالب علم مولانا فضل امام کی مذمت میں حاضر ہوا اور کیفیت عرض کی۔ چنانچہ مولانا فضل حق بلائے گئے۔ مولانا فضل امام نے اس زور سے تھپڑ مارا کہ دستارِ فضیلت دور جا پڑی اور غیض آلود انداز میں فرمایا:

"تو تمام عمر بسم اللہ کے گنبد میں رہا، ناز و نعم میں پرورش پائی جس کے سامنے

---

[1] الثورۃ الہندیہ ص ۲۹ و ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ محرم ۱۳۸۰ھ۔ مضمون سراج الہند، [2] الثورۃ الہندیہ ص ۳۳-۳۴
[3] ایضاً [4] تذکرہ علمائے ہند۔

کتاب رکھی اس نے خاطرداری سے پڑھایا۔ طلبہ کی قدر و منزلت تو کیا جانے اگر مسافرت کرتا۔ بھیک مانگتا اور طالب علم بنتا تو حقیقت معلوم ہوتی۔ طالب علم کی قدر ہم سے پوچھیے[1]

یہ سلسلۂ تعلیم ۵۳ برس کی عمر تک جاری رہا، جیساکہ مولوی رحمٰن علی کی ملاقات سے واضح ہوتا ہے۔

ملازمت اور خودداری والد کے انتقال کے وقت مولانا کی عمر اٹھائیس[2] سال تھی۔ اکبر شاہ ثانی کا دور تھا کہ دہلی میں ریذیڈنٹ بہادر کے دفتر میں سررشتہ ہو گئے۔ مولانا نازک مزاج اور خوددار واقع ہوئے تھے، لیکن اس ملازمت میں عزت و احترام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا چنانچہ استعفیٰ دے کر اس ناگوار ماحول سے جان چھڑالی۔ نواب فیض محمد خان والی جھجر نے پانصد روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور بصد قدر و منزلت اپنے ہاں بلا لیا۔ دہلی سے روانہ ہوتے ہوئے ابوظفر بہادر (جو اُس وقت ولی عہد تھے) سے ملاقات ہوئی۔ ابوظفر نے اپنا خاص دوشالہ اُڑھایا اور بچشم پُرنم کہا:

"ہر گاہ شما می گوئید کہ من رخصت می شوم مرا جز ایں کہ بیدار م. گریز نیست اما ایزد دانا کہ لفظ وداع، از دل بزبان نمی رسد الا ابصار بجر تقیل۔"[3]

جھجر کے بعد الور میں دو سال تک کسی بڑے عہدے پر فائز رہے۔ اس کے بعد نواب ٹونک کے ہاں بھی قیام کیا۔ بعد ازاں نواب یوسف علی خان والی رامپور نے بلا لیا، اور پہلے محکمہ نظامت اور پھر مرافعہ عدالتین پر مامور کیا گیا[4] نواب یوسف علی خان اور نواب کلب علی خان نے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ آٹھ برس تک رامپور میں قیام کے بعد لکھنؤ چلے گئے۔ یہاں پہلے صدر الصدور بنائے گئے۔ اور جب ایک کچہری "حضور تحصیل" کے نام سے وجود میں آئی تو اس کے مہتمم قرار پائے[5] آخر گڑھی ہنومان (متصل اجودھیا۔ فیض آباد) کے المیہ سے متاثر ہو کر ملازمت چھوڑ دی۔ واقعہ یوں ہے کہ نے مسجد میں اذان سے روک دیا۔ اگر کوئی مسلمان مسجد میں جا نکلتا اور اذان کہتا تو مار پیٹ کر نکال دیا جاتا۔ ۱۳ ذی قعدہ ۱۲۷۱ھ (جولائی ۱۸۵۵ء) کو شاہ

---

1. الثورۃ الہندیہ صفحہ ۱۹۴ 2. کلیات نثر غالب فارسی 3. انتخاب یادگار۔ امیر مینائی
4. ۱۸۵۷ء کے مجاہد صفحہ ۱۳۰۔

غلام حسین اور مولوی محمد صالح اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر بنواں گڑھی گئے۔ پیراگیوں سے مقابلہ ہوا مسجد میں دو سو انہتر ۲۶۹ مجاہدین شہید ہو گئے۔[1] کسی نے تاریخ کہی ہے

پیٹے سال کم چوں بہمت بست   ملہم غیب گفت یافت شکست

دوسری روایت یہ ہے کہ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی قیام لکھنؤ کے دوران میں ان سے ملے تھے اور مولانا نے احمد اللہ شاہ کے کہنے پر ملازمت چھوڑ دی۔[2] اور الور چلے گئے۔

مولانا کی علمی زندگی | مولانا ایک کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور رئیسوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ بچپن میں سبق پڑھنے کے لئے بھی ہاتھی اور پالکی میں جاتے تھے۔ جفاکشی سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ علمی و تدریسی شوق کی بدولت البتہ ان کا شمار علماء کے گروہ میں ہونے لگا تھا، لیکن افکار و خیالات اور اعتقادات کی بناء پر ان کی حیثیت کوئی زیادہ پُر وجاہت نہ تھی۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی "تقویت الایمان" کی ایک عبارت پر امتناع نظیر خاتم النبیین اور امکانِ نظیر کی بحث چھیڑ دی۔ غالب سے چونکہ مولانا فضل حق کے تعلقات دوستانہ تھے، لہٰذا اس بحث میں غالب کو بھی گھسیٹ لیا۔ اگرچہ غالب کو ان مسائل سے بقول حالی کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن دوستداری کی خاطر اشعار مثنوی لکھ دیئے۔[3]

مولانا غالب کے گہرے دوست تھے کیونکہ طرفین میں اشتراکِ مذاق پایا جاتا تھا۔ مولانا شعر فہم بھی تھے اور غالب کی طرح شطرنج سے بھی دل بہلایا کرتے تھے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ مولانا فضل حق ایک دن تن آسانی کو چھوڑ کر یک لخت جہد و جہاد میں کود پڑیں گے۔

تصانیف | مولانا نے گوناگوں مشاغل کے باوجود تصانیف کی خاصی مقدار چھوڑی ہے

۱۔ الجنس العالی شرح جواہر المعالی
۲۔ شرح افق المبین
۳۔ حاشیہ تلخیص الشفاء
۴۔ حاشیہ شرح مسلم قاضی مبارک
۵۔ ہدیہ السعیدیہ
۶۔ رسالہ تشکیک ماہیات
۷۔ رسالہ کلی طبعی
۸۔ رسالہ علم و معلوم

---

[1] قیصر التواریخ ج ۲ ص ۱۱۳
[2] علماء حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں ص ۶۰
[3] یادگار غالب۔

۹۔ روض المجود فی حقیقت وحدت الوجود ۱۰۔ رسالہ قاطیغوریاس
۱۱۔ رسالہ تحقیق حقیقت الاجسام ۱۲۔ الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان)
۱۳۔ قصائد فتنۃ الہند ۱۴۔ مجموعۃ القصائد
۱۵۔ امتناع نظیر ۱۶۔ تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی[1]

مولانا ویسے تو علم و فضل کے دریا تھے، لیکن عربی ادب اور معقول میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔[2] "علمائے ہند" میں "رسالہ تشکیک اور "رسالہ طبعی وکلی" کو ایک ہی رسالہ بتایا گیا ہے، مگر حقیقت یہ نہیں۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کے شاگرد مولانا عبداللہ بلگرامی نے تصانیف کا شمار کراتے ہوئے لکھا ہے۔ "رسالہ فی تحقیق الکلی والطبعی و رسالہ فارسیہ فی تحقیق التشکیک" ان دونوں رسالوں کی زبانیں جدا ہیں، اور یہ دونوں رسالے طبع نہیں ہوئے۔[3]

سخن فہمی | مولانا کے وطن خیرآباد میں شاعری کے چرچے تھے، دہلی میں آئے تو یہاں قلعہ معلی سے لیکر عیش خان کے پھاٹک تک شاعروں کے جمگھٹے تھے، غالب، صہبائی، مومن، آزردہ، نیر، نثار، شیفتہ، ممنون، نصیر اور ذوق وغیرہ آسمان شاعری کے درخشاں ستارے تھے۔ اس شاعرانہ ماحول میں یہ ناممکن تھا کہ مولانا جیسا نازک مزاج اور شاعر طبع شخص شعر نہ کہتا، عربی و فارسی دونوں زبانوں میں اشعار کہے، لیکن عربی کو نسبتاً زیادہ برتا، فارسی شاعری میں فرقتی تخلص کرتے تھے۔

فرقتی در کعبہ رفتی بارہا نامسلمان نامسلمانی ہنوز[4]

اردو ادب پر احسان | عربی زبان میں بیسیوں قصائد کہے ہیں ـــــ مرزا غالب سے غایت درجہ کے تعلقات تھے۔ مرزا ابتدا میں بیدل کے تتبع میں مشکل پسندی کی طرف مائل تھے اور اس مشکل پسندی نے غالب کے کلام میں غرابت پیدا کر دی تھی۔ آخر غالب نے اس قدیم اور مشکل روش کو چھوڑ کر آسان کہنے کی عادت بنائی۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں، کہ

"مولوی فضل حق صاحب فاضل بے بدیل تھے۔ ایک زمانے میں دہلی میں سررشتہ دار تھے۔ اس عہد میں مرزا خان کو زوال تھے، وہ مرزا قتیل کے شاگرد

---

[1] الثورۃ الہندیہ ص ۹۶ [2] مولانا ۱۸۵۷ء کے مجاہد ص ۱۳۷ [3] مکتوب مولوی سید نجم الحسن رضوی معارف ج ۶۰ ص ۳۹۵ [4] گلزار بہار

تھے۔ نظم و نثر فارسی اچھی لکھتے تھے، غرضیکہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسہ اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ انہوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا، تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا جو کچھ کہہ چکا اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا، خیر ہوا سو ہوا، انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو عینک کی طرح لوگ آج آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں"[1]

مولانا حالی لکھتے ہیں :

"مولوی فضل حق کی تحریک سے انہوں (غالب) نے اپنے اردو کلام میں سے جو اس وقت موجود تھا، دو ثلث کے قریب نکال ڈالا اور اس کے بعد اس روش پر چلنا چھوڑ دیا۔"[2]

اردو ادب کے شیدائیوں پر مولانا فضل حق کا یہ احسان ہے کہ انہوں نے غالب کو مشکل پسندی اور بے معنی طرز بیان کو چھوڑ کر سادہ کہنے کی ترغیب دی، اور غالب نے آسان کہہ کر اردو کا دامن مزید بھر دیا۔ مزید غالب کا وہ کلام جو مروجہ دیوان میں شامل نہیں ہے۔ اُسے دیکھ کر اس حقیقت کا بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ مولانا فضل حق کس قدر "گوہر شناس" تھے۔

مولانا کی سیاسی زندگی مولانا کی ابتدائی زندگی دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں سیاسی امور سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان کا مطمح نظر یہی تھا کہ اچھی زندگی بسر کریں۔ جہاں رہیں عزت سے رہیں، اور آرام و سکون کی زندگی گزار دیں۔ تفریح کی خاطر شطرنج یا شعر و شاعری سے دل بہلالیں۔ اور علمی ذوق کی تسکین کی خاطر بچوں کو معقولات و ادب کا درس دے لیں، البتہ آخری عمر میں انگریزی اقتدار کی خرابیاں اُن پر منکشف ہوئیں اور دیدہ و دانستہ اصحاب سے مل کر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ انگریزوں کا مقصود اہل ہند کو عیسائی بنانا ہے۔ اور اسطرح اپنی حکومت کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں یہ وہ تاثر تھا جس نے ان کے سرد خون میں جوش پیدا کر دیا، اور ٹھنڈے دماغ میں باغیانہ عزائم ابھرنے لگے اور آخر عملی سیاست میں کود پڑے۔ مولانا نے خود نوشت "الثورۃ الہندیہ" میں

---

[1] آب حیات ص ۵۱۲ [2] یادگار غالب ص ۲۰۱

مخالفت کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے مندرجہ ذیل وجوہ مخاصمت لکھے ہیں۔

۱۔ انگریزوں کا داعیہ تبدیلِ مذہب۔

۲۔ غلّے پر کنٹرول کرنا۔ اس کا مقصود یہ تھا کہ غلّے پر خود کنٹرول کر لیا جائے۔ جب لوگوں کو خوراک نہ ملے گی تو وہ ہر حکم کی تعمیل پر مجبور ہوں گے۔

۳۔ احکامِ دین مٹانا۔ مثلاً مسلمانوں کو ختنہ سے روکنا اور پردہ نشین عورتوں کو بے پردہ کرنا۔

۴۔ ہندو اور مسلمان سپاہیوں کے عقائد گندے کرنا۔

جنگِ آزادی | مولانا فضل حق ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ سے الور چلے گئے تھے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں ہنگامہ شروع ہوا۔ مولانا اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی میں وارد ہوئے، بہادر شاہ ظفر سے گذشتہ تعلقات تھے۔ اس لئے بادشاہ سے ملنے میں انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ جیون لال کے روزنامچے سے ان کی محل میں آمد و رفت معلوم ہوتی ہے، وہ خبریں دربار میں پہنچاتے رہتے تھے۔

بہادر شاہ کے مقدمے میں ذکر ہے کہ ۱۸ اگست ۱۸۵۷ء کو دوسرے افراد کے علاوہ مولانا نے بھی مختلف افراد کے نام احکام لکھے، لیکن نواب زینت محل کے خوابیدہ ہونے کی وجہ سے ان پر مہریں نہ ہو سکیں، کیونکہ مہر نواب زینت محل کے پاس ہی تھی۔ ایک دوسرے مقام میں مذکور ہے کہ مولانا نے مولوی عبدالحق خان کے نام ضلع گوڑگانوہ کے مالیے کی تحصیل کے لئے فرمان لکھا اور مولانا کے ایک عزیز کو وہاں بھیجنے کا فیصلہ ہوا تھا۔[1]

مولانا کی کتاب سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ کامیابی کے بارے میں زیادہ پُرامید نہیں تھے، وہ دیکھ رہے تھے کہ :۔

۱۔ بادشاہ ضعیف، غم زدہ اور ناتجربہ کار ہے۔

۲۔ بادشاہ امورِ جنگ خود انجام دینے کے بجائے اپنے وزیر حکیم احسن اللہ خان اور بیگم نواب زینت محل کا محکوم تھا۔

۳۔ انگریزوں کا مقابلہ کرنے والی فوجیں بے سردار اور منتشر تھیں۔ ان میں کوئی رابطہ باہمی نہ تھا۔

۴۔ بادشاہ کے بیٹے ناتجربہ کار بزدل اور عاقبت نااندیش تھے۔ انہیں دیانتداروں

---

[1] مقدمہ بہادر شاہ صفحہ ۱۸۴

اور عقل مندوں سے نفرت تھی۔

فتویٰ | مولانا دہلی پہنچے تو انہوں نے فتویٰ تیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اور انہوں نے علماء کے نام تجویز کئے جن سے دستخط لیئے گئے۔[۱] دستخط کرنیوالوں میں مولانا فضل حق کے ہم سبق مفتی صدر الدین آزردہ بھی شامل تھے۔ جن کے سلسلے میں ایک لطیف توجیہ پیش کر کے مفتی صاحب کی جان بچائی گئی۔ یہی وہ فتویٰ تھا، جو ان کے خلاف باغیانہ مقدمہ کا باعث بنا۔

دہلی سے روانگی | ۱۹ ستمبر کو شہر دہلی انگریزی فوجوں نے تاراج کر دیا۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ دن بھوک کے پیاسے مکان میں بند رہے۔ پھر اہل و عیال کو ساتھ لیکر رات کی تاریکی میں نکلے اور مشقتوں کے بعد بھیکن پور (ضلع علی گڑھ) پہنچے۔ وہاں اٹھارہ روز رہے پھر نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خان شروانی کے عم محترم نواب عبدالشکور خان رئیس بھیکن پور نے سانکرہ کے گھاٹ سے جو بھیکن پور سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے، دریا کے پار اتار دیا۔[۲] کچھ عرصہ روپوش رہے۔ عرصۂ روپوشی کے حالات پردۂ تاریکی میں ہیں۔

گرفتاری | ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو عفو عام کا اعلان ہوا۔ مولانا فضل حق بھی اس اعلان پر اعتماد کرتے ہوئے خیرآباد جا پہنچے، لکھتے ہیں:

"مجھے اس بات کا بالکل خیال نہ رہا کہ بے ایمان کے عہد و پیمان پر اعتماد اور بے دین کی قسم پر بھروسہ کسی بھی حالت میں درست نہیں۔ خاص طور پر جبکہ بے دین جزا و سزائے آخرت کا بھی منکر ہو۔"[۳]

چند روز اطمینان سے گزر گئے۔ پھر دو بے ایمان اور جھگڑالو افراد نے مخبری کی اور مولانا کو اپنے مکان سے گرفتار کر لیا گیا، اور مقدمے کے لئے لکھنؤ روانہ کر دیا گیا۔

روداد مقدمہ و سزائے حبس دوام بہ عبور دریائے شور | مولانا کے مقدمے کے بارے میں ایک روایت زبان زدِ خاص و عام ہے کہ جب مولانا کا مقدمہ پیش ہوا تو اتفاقاً جج مولانا کا شاگرد نکل آیا۔ اس نے صدر الصدوری کے دور میں مولانا سے کچھ کام سیکھا تھا۔ وہ انہیں رہا کر دینا چاہتا تھا۔ گواہوں نے مجسٹریٹ کی مدد کی اور مولانا کو پہچاننے سے انکار کر دیا، لیکن مولانا نے برملا کہا کہ ہاں! فضل حق میں ہوں اور میں نے ہی اس باغیانہ فتویٰ پر دستخط کئے ہیں۔

---

[۱] ۱۸۵۷ء کے مجاہد۔ مہر ص۱۳۳ ۔ [۲] الثورۃ الہندیہ ص۱۵۸ [۳] ایضاً ص۱۶۰